تصوف: تلاش احسن کی ہمہ گیر تحریک

ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج☆

اسلامی علوم کو تین اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول فقہ، دوئم تصوف اور سوئم فلسفہ۔ فقہ ظاہری احکام کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ تصوف ان ظاہری احکام کی باطنی کیفیت کو اجاگر کرتا ہے اور فلسفہ ان احکام کے صحیح اور راست ہونے کے دلائل فراہم کرتا ہے۔ یہ تینوں علیحدہ علیحدہ علوم ہیں۔ مگر اس وقت ہم صرف تصوف کے بارے میں کچھ عرض کریں گے۔

اہل علم نے تصوف کے درج ذیل مادہ ہائے اشتقاق بیان کئے ہیں۔:

۱۔ بعض نے اسے الصفا سے مشتق مانا ہے۔ جس کے معنی صفائی اور پاکیزگی کے ہیں۔۔۔ اس مادہ اشتقاق کی رو سے کسی شے کو ہر طرح کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک وصاف کر کے اجلا اور شفاف بنا دینا تصوف ہے۔ حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ المعروف بہ داتا گنج بخش لاہوری نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں شیخ حصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ التصوف صفاء السر من کدورۃ المخالفۃ ترجمہ: باطن کو مخالفت حق کی کدورت اور سیاہی سے پاک وصاف کر دینے کا نام تصوف ہے۔(۱)

۲۔ بعض کے خیال میں یہ ''الصفو'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی محبت اور دوستی میں اخلاص کے ہیں۔ جیسے کہ المنجد میں ہے الاخلاص فی مودۃ الصدیق المخلص۔(۲)

۳۔ بعض کے نزدیک یہ الصوف سے مشتق ہے۔ جس کے معنی اون کے ہیں اور باب تفعل کے وزن پر

☆استاذ الفقہ والتفسیر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

تصوف کا معنی ہے۔ اس نے اونی لباس پہنا۔۔۔ بعض مردان حق نے قرون اولیٰ میں اظہار تذلل، مجاہدہ اور غایت درجہ عجز ونیاز کی خاطر کھردرا لباس پہنا۔ چنانچہ اس اونی لباس کی مناسبت سے ان کو ''صوفی'' کا لقب ملا۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ میری ان ستر صحابہ سے ملاقات ہوئی۔ جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی اور انکا لباس پشمینہ کا تھا۔(۳)

۴۔ بعض کے نزدیک یہ الصفہ سے قریب ہے۔ جیسا کہ شیخ ابوبکر بن اسحٰق بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ صوفیاء کی وجہ تسمیہ ان کا با اعتبار اوصاف اصحاب صفہ سے قریب تر ہوتا ہے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں موجود تھا۔

۵۔ بعض علماء تصوف کو الصف سے مشتق قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ امام ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ تصوف، صف سے مشتق ہے۔ گویا کہ صوفیاء کے قلوب باری تعالیٰ کے حضوری کے اعتبار سے صف اول میں ہوتے ہیں۔

۶۔ بعض کے نزدیک یہ صفۃ سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ سارا تصوف محاسن کے ساتھ متصف ہوتا ہے۔(۴)

امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ تصوف کی لغوی بحث بالتفصیل نقل کرنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار یوں فرماتے ہیں۔ اس لفظ کا ماخذ اشتقاق عربیت کے لحاظ سے اور قواعد صرف کی رو سے صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ صحیح یہ ہے کہ یہ اس فن کا ایک لقب ہے۔ واضح رہے کہ علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے امام قشیری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اس رائے کو پسند کیا ہے۔

بعض لوگ تصوف کا انکار محض اس بناء پر کر دیتے ہیں کہ یہ اصطلاح رسول پاک ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اور تابعین کے زمانے میں رائج نہ تھی۔ حالانکہ یہ ایک فضول بات ہے۔ اگر تصوف کا لفظ حضور ﷺ کے زمانے میں رائج نہ ہونے کی وجہ سے بدعت اور قابل نفرت ہے تو بقول ابو الفیض قلندر علی سہروردی کے اہلحدیث، اہل قرآن، دیوبندی، وہابی، شیعہ، ندوی اور لیڈر (جیسے الفاظ) کب رائج تھے۔ ''کانگریسی، لیگی، احراری، خاکسار، نیلی پوش، سرخ پوش، خدائی فوجدار کہاں تھے؟ حکیم الامت، علامہ، مولانا، مولوی کا کب ذکر ہوا تھا؟ کیا صحابہ کرام کی جماعت میں کوئی بزرگ مولوی ابوہریرہ، یا مولانا معاذ بن جبل یا ملا ابن مسعود، علامہ ابن عباس یا حکیم الامت ابن عمر مشہور تھے؟(۵)

قاضی قیصر الاسلام کے نزدیک مسلک تصوف کی کوئی مکمل تعریف ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ اس کا انحصار ذاتی رجحانات اور مشاہدہ یا وجدان پر ہے۔ چنانچہ جداگانہ وجدانی صورت احوال کے مختلف النوع تجربات کا میدان بڑا وسیع ہو جاتا ہے۔ تاہم ایک بات ضرور ہے کہ جسکو منجا کی ذوقی کیفیات میسر آ گئیں

کی اسی اعتبار سے حقیقت الامر کا فہم حاصل ہوگا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہد بہ عہد تصوف کی مختلف صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ابتدائے اسلام میں تصوف محض زہد و ورع کی ایک شکل تھی، اور پھر اس میں آمیزش کے آثار پائے جانے لگے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ صرف اسلامی تصوف میں اتنی بے شمار صورتیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ جو باہم ایک دوسرے سے متخالف معلوم ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس صورتحال میں تصوف کی مختلف تعریفات میں کسی "قدرِ مشترک" کی جستجو کرنا بہت دشوار گزار کام ہے۔ (۶)

تاہم باطنی مشاہدات کی پوری تاریخ کے پس منظر میں ہمیں صوفیاء کے یہاں جو مختلف تعریفات تصوف کی ملتی ہیں، ہم یہاں انہیں مختصراً ذکر کریں گے۔ کیونکہ قاعدہ اور دستور یہی ہے کہ کسی بھی علم و فن کو سمجھنے اور سیکھنے کے لیے ان علوم و فنون کے ماہرین کے اقوال کا پابند ہونا اور انکی پیش کردہ تعریفات میں ہی اس علم و فن کو سمجھنا اور دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ منزل ہے جہاں تقلید کے بغیر بات بنتی نظر نہیں آتی۔ اس لیے ہم بھی تصوف کی اس تعریف کو معتبر اور لائق تسلیم سمجھتے ہیں، جو صوفیاء نے کی۔

۱۔ حضرت محمد بن حسین بن علی بن ابی طالب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں۔ تصوف نیک خوئی کا نام ہے۔ جتنا کوئی شخص نیک خوئی میں بڑھا ہوا ہوگا اتنا ہی تصوف میں بڑھ کر ہوگا۔

۲۔ حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۲۰۰ھ/۸۱۶ء) فرماتے ہیں کہ حقائق کو گرفت میں لانا، دقائق پر گفتگو کرنا، اور خلائق کے پاس جو کچھ ہے، اس سے ناامید ہونا تصوف ہے۔

۳۔ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۲۴۵ھ/۸۵۹ء) فرماتے ہیں کہ صوفی وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے تمام کائنات میں صرف خدائے بزرگ و برتر کو پسند کیا ہے۔

۴۔ حضرت ابوالحسین نوری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۲۹۵ھ/۹۰۸ء) فرماتے ہیں کہ صوفی وہ لوگ ہیں کہ جنکی روح بشریت کی کدورت سے آزاد ہو چکی ہے اور آفت نفس سے صاف، ہوا و ہوس سے خالص ہوگئی ہے۔ یہ لوگ صف اول اور درجہ اعلیٰ میں خدا سے قریب ہیں۔ وہ نہ کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں اور نہ کسی کے مملوک۔ تصوف نہ علوم کا نام ہے اور نہ رسوم کا بلکہ یہ ایک اخلاق کا نام ہے۔ اگر یہ رسم ہوتا تو مجاہدہ سے حاصل ہو جاتا اور اگر یہ علم ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہو جاتا۔

۵۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (۲۹۷ھ/۹۱۰ء) فرماتے ہیں کہ عارف وہ ہے کہ جب حق تعالیٰ اسرار نہانی سے گفتگو کرتا ہے تو وہ خاموش رہتا ہے۔ معرفت خدائے تعالیٰ کے ساتھ مشغول رہنے کا نام ہے۔ تصوف ذکر ہے۔ وہی حق ہے اور پھر نہ یہ ہے اور نہ وہ ہے۔ نیز فرماتے ہیں: تصوف

کی آٹھ خصلتیں ہیں۔ سخاوت، رضا، صبر، اشارت، غربت (اجنبی ہونا) لباس صوف، سیاحت اور فقر۔۔۔۔ سخاوت کا نمونہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، رضا کا نمونہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں، صبر کا نمونہ حضرت ایوب علیہ السلام ہیں، اشارت کا نمونہ حضرت زکریا علیہ السلام ہیں، غربت کا نمونہ حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں، صوف پوشی کا نمونہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، سیاحت کا نمونہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور فقر کا نمونہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔۔۔۔ نیز فرماتے ہیں: تصوف یہ ہے کہ اللہ تجھے تیری ذات سے فنا کردے اور اپنی ذات کے ساتھ زندہ رکھے۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک مرتبہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے سوال کیا کہ ولی کی تعریف کیا ہے؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ جس کے چہرے پر حیاء، آنکھوں میں گریہ، دل میں پاکیزگی، زبان پر ثناء، ہاتھوں میں بخشش، وعدہ میں وفا اور باتوں میں شفا ہو۔

۷۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں، ولی اسے کہتے ہیں کہ جو خدا کی محبت و رضا کو بلا طلب اغراض منظور خاطر رکھے۔ توکل و اخلاص کو شیوہ بنائے، نفس کے ساتھ جہاد کرے، روح کو ذکر الٰہی سے زندہ کرے، امیروں میں جب بیٹھے تو اپنے شرف و احترام کا خیال رکھے، فقیروں کی مجلس میں عاجزی کرے، بے شرمی، شوخی اور بدخلقی سے بچے، مسلمانوں سے حسن ظن رکھے، اور ان کے مفاد کو پیش نظر رکھے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کوشاں رہے۔ کسی کی برائی اور بغض و کینہ کو اپنے سینے میں نہ رکھے، سوائے خدا کے کسی سے نہ ڈرے، ادائے فرض میں کسی مصیبت اور آزمائش سے نہ گھبرائے۔ اپنی روزی قوت بازو سے پیدا کرے۔

۸۔ امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں: منزل تصوف کا راستہ یہ ہے کہ پہلے مجاہدہ کرے۔ صفات مذمومہ کو مٹائے، تمام تعلقات کو توڑ ڈالے اور پوری طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جب یہ عادت حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل کا متولی بن جاتا ہے اور علم کے انوار سے اسکو منور کرنے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔

تصوف کے بارے میں متعدد صوفیائے کرام کی آراء آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ ان تعریفات میں آپ کس تعریف کو غیر اسلامی نظریات کا مجموعہ، عجمی افکار کا مظہر، مسیحی رہبانیت کا عکس، ہندو ازم سے ماخوذ یا مانویت کا سرچشمہ کہہ سکتے ہیں؟ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ ان واضح اور روشن تعریفات کے باوجود مستشرقین کو مسلمانوں میں اپنے ہمنوا کیسے مل گئے کہ جنہوں نے اسلامی تصوف کو وحدت کے نظریے ترک علائق، وحدت الوجود کے نظریہ ترک دنیا اور عیسائیت کے نظریہ رہبانیت کے مشابہ قرار دیا ہے۔

میرے خیال میں تصوف کو ویدانت ازم، مانویت، اشراقیت، یوگا، مسیحی رہبانیت یا بدھ ازم وغیرہ کا نام دینا اور اس کے خوشگوار اثرات کو افیون اور کوکین جیسا سمجھنا لاعلمی، کم نظری، ناقص الفہمی، بے بضاعتی، کج بحثی اور تصوف دشمنی کے سوا کچھ نہیں۔

تصوف کو مسیحی رہبانیت سمجھنے والے اپنے دعویٰ میں چلہ کشی اور ریاضت کو بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ خانقاہوں میں نشینان عزلت وخلوت کو راہب اور جوگی تصور کر سکتے ہیں۔ مگر ان کا یہ سمجھنا بھی بر صواب نہیں۔۔۔۔ جس طرح ایک طالب علم حصول علم دین کے لیے، ایک کاریگر حصول معاش کے لئے، ایک سیاح اپنے مشن کے لئے، ایک ملازم اطاعت مقتدر کے لئے، اگر سالہا سال تک گھر اور وطن سے دور رہتا ہے اور اسکی زندگی پر رہبانیت کا شبہ بھی نہیں کیا جاتا تو پھر کیا یہ ناانصافی نہیں کہ ایک متلاشی حق نے اسی طریق پر اگر چند سال زہد و ریاضت میں گزار دیے، اصلاح نفس کے لئے کچھ عرصہ کسی پیر طریقت کے ارشاد پر بادیہ پیمائی کی تو اس پر رہبانیت کی پھبتی کس دی جائے۔ جبکہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کی مقدس جماعتوں میں خود ایسے لوگ پائے جاتے ہیں۔ جنکا طرز عمل وہی تھا۔ جو آجکل کے ایک خدا شناس صوفی کا ہے۔ اصحاب صفہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

مقام غور ہے کہ کتنی تنگ ودو کے ساتھ صوفیوں کے فعل چلہ کشی کو بدعت کا رنگ دے کر اچھالا جاتا ہے۔ فقط اس لئے کہ ان لوگوں کے زعم باطل میں صوفی کا چلہ کشی کرنا رہبانیت کا جزو اعظم ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ کے لئے چالیس دن کی میعاد مقرر فرمائے جانے کا ذکر بڑی وضاحت سے آیا ہے۔ (۷) اور بقول عبدالماجد دریابادی "مرشد تھانوی نے فرمایا کہ اہل سلوک کے یہاں جو چلہ میعاد متعارف ہے۔ اسکی اصل یہیں سے ہے۔"(۸)

اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام اولاد کے لئے دعا فرماتے ہیں۔ جواب میں خوشخبری ملتی ہے کہ ہم تجھ کو یحییٰ نام کا بیٹا عطا فرمائیں گے۔ عرض کرتے ہیں۔ کوئی نشانی فرمائی جائے تو جواب ملتا ہے کہ تو تین دن خاموشی (یعنی چپ) کا روزہ رکھ اور فقط اشارے سے بات کر اور اللہ کا صبح شام کثرت سے ذکر کر، حضرت زکریا علیہ السلام کو بیٹا ملا مگر تین دن کا یہ مختصر سا چپ کا روزہ اور مجاہدہ بیٹے کے پیدا ہونے سے کیا تعلق رکھتا تھا۔ معلوم ہوا کہ قدرت کے کچھ قوانین ہیں اور عموماً نتائج ان ہی قوانین کی پابندی سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر علمی تحقیق سے کام لیا جائے تو مجاہدہ کا سب سے بڑا رکن چلہ کشی ہے۔ جس کے بغیر مجاہدہ مکمل نہیں ہوسکتا۔

آنحضرت ﷺ کا چلہ کے متعلق ارشاد احادیث میں بایں الفاظ آتا ہے:

مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰهِ تعالی اربعین صباحا ظهرت له ینابیعُ الحکمة علی لسانه ومن قلبه

یعنی جس نے چالیس دن اللہ کے لئے خلوص سے گزار دیے۔ حکمت کے چشمے اسکے دل وزبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔(۹)

غرض یہ کہ غار حرا میں آنحضرت ﷺ کی چلہ کشی اور ریاضت ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اور ذکر الٰہی پر مداومت کے متعدد احکام قرآن وسنت میں بصراحت موجود ہیں۔ پس خانقاہوں کے گوشہ نشینوں کی مثال بعینہ ایسی ہوئی، جیسے فوج میں کسی رنگروٹ کو بھرتی کیا جائے اور اسے کچھ عرصے کے لئے چھاؤنی میں بھیج دیا جائے، جہاں اسکی عسکری تربیت وتنظیم کی جائے تاکہ وہ دشمنوں پر موثر حملہ کرنے کے قابل ہو سکے۔ اگر کسی رنگروٹ کو ٹریننگ کے مراحل سے گزارے بغیر محاذ جنگ پر بھیج دیا جائے تو یقین کیجئے وہ رنگروٹ کسی دشمن پر موثر حملہ تو کیا کرے گا۔ خود اپنے ہی لشکر کے لیے وبال جان بن جائے گا۔ اسی لیے علمائے کرام کو کچھ عرصہ روحانی چھاؤنیوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں اسکی روحانی تربیت وتنظیم ہوتی ہے تاکہ جب وہ عملی میدان میں قدم رکھیں تو دین کی تبلیغ بڑے موثر طریقے سے کرسکیں۔

بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سطحی سا سوال پیدا ہوتا ہے کہ رائج الوقت انداز میں صحابہ نے مجاہدے کہاں کیئے؟ حالانکہ یہ امر خوب واضح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے دور پاک میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی تمام ظاہری وباطنی منزلیں بآسانی طے ہو جایا کرتی تھیں۔ انہیں مراقبوں، مکاشفوں اور وظیفوں کی خاص ضرورت نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ کی صحبت بابرکت تمام وظیفوں اور چلوں، تمام مجاہدوں اور ریاضتوں سے برتر وافضل تھی۔ اس لیے صحابہ کو زیادہ مشقتوں یا انفرادی عبادتوں کی ضرورت نہ تھی اور ویسے بھی صحابہ کی حیات مستعار کے بیشتر حصے غزوات وسرایا میں بسر ہوئے کیونکہ وہ دور اسلام کی بقاء وارتقاء کا دور تھا۔ دور صحابہ کے بعد تابعین کا عہد شروع ہوا۔ اور ان کے بعد تبع تابعین کا۔ ہر دور میں ایمان کی حالت وکیفیت وہ نہ رہی۔ جو ان کے پیشرووں کی تھی۔ ایمان میں بتدریج ضعف وکمزوری کے احساس نے مسلمانوں کو علوم شریعت پر باقاعدہ توجہ دینے پر مجبور کیا۔ جو مسلمان يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ کی عملی تفسیر بنے وہ فقہا کہلائے اور جنہوں نے يُزَكِّيهِمْ پر خصوصی توجہ دی وہ صوفیا واولیا کہلائے۔

تصوف کے حوالے سے صوفی کے لقب کو اختیار کرنے والے سب سے پہلے بزرگ کا نام ابو الہاشم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۵۰ھ) ہے۔ اور اسلام میں سب سے پہلی خانقاہ قائم کرنے والے بھی یہ ابو ہاشم ہیں۔ خانقاہ ہونے کی ضرورت انہیں اس لیے پیش آئی تھی کہ مسجدوں میں بجائے یاد الٰہی کے مسلمان باہم جنگ وجدل میں مصروف تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دوسری صدی ہجری کے اختتام تک کم وبیش ساتھ

ہزار مسلمان، مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے۔ جنگ جمل، جنگ صفین، مختار ثقفی کا خروج اور ا شکست اور واقعہ کربلا اس کی دلیلیں ہیں۔ مسجدوں میں تلواریں چل رہی تھیں۔ تو ابو ہاشم صوفی نے خدا کو یاد کرنے کے لیے گوشہ نشینی اختیار کرتے ہوئے سب سے پہلی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اور آہستہ آہستہ یہ خانقاہ مسلمانوں کی ضرورت بن گئی۔ ابو ہاشم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی اتباع میں سیکڑوں چراغ جلے۔ خانقاہوں پر خانقاہیں تعمیر ہونے لگیں۔ (۱۰)

شمس بریلوی کے بقول تصوف میں سوائے اتباع شریعت کے اور کچھ نہیں۔ اور بصد معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ مدارس دینیہ میں فارغ التحصیل طلبہ سے اتباع شریعت کا عہد نہیں لیا جاتا جبکہ خانقاہوں میں بیعت کرتے وقت صوفیاء سے اتباع شریعت کا عہد لیا جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ خانقاہی نظام میں ایک برائی در آئی۔ وہ یہ کہ باپ کے بعد اس کے بیٹے کو جانشین بنانے کی رسم چل نکلی۔ بیٹا نہ ہوا تو بھائی کو، بھائی نہ ہوا تو داماد کو، داماد نہ ہوا تو بھتیجے یا بھانجے کو خلیفہ بنایا جانے لگا اگرچہ وہ نا سعادت ہی کیوں نہ ہو۔ (۱۱)

راقم الحروف نے ''سیاسی، مذہبی اور روحانی ملوکیتیں'' کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا تھا۔ اسی مضمون سے ایک اقتباس ذیل میں رقم کر رہا ہوں۔ جو موضوع زیر بحث میں مفید ہے۔

''سیاست و مذہب میں نظام ملوکیت سے جو خرابیاں در آئی ہیں۔ وہ نظام اگر روحانیت میں قائم ہو جائے تو وہاں بھی اپنے اثر سے خالی نہیں ہوتا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نظام بیعت و خلافت میں بھی سیاست و مذہب کی طرح شرائط اہلیت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے، باپ اپنے بیٹے کو جانشین بنا جاتا ہے۔ (یا وہ خود بن جاتا ہے) پھر ظاہر ہے کہ جو خرابیاں اور ناکامیاں، وحشتیں اور بربریتیں اس نظام سے جہاں جہاں رونما ہوتی ہیں۔ وہ یہاں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ ہمارے معاشرے میں جس قدر جاہل پیروں (قرآن و سنت سے نابلد) کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ لوگوں میں تہذیب نفس، تزکیہ باطن، تصفیہ قلب اور اصلاح ذات کا فقدان بھی اسی تیزی سے نمایاں ہو رہا ہے۔ افسوس کہ اب پیری مریدی، سو فیصد ایک کاروبار اور دھندا بن چکا ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک رسم (اِلا ماشاءاللہ) عصر حاضر میں کسی پیر کی عظمت کا اندازہ مریدوں کی کثرت، نیز اس کی ٹھاٹ باٹ اور عیش و آرام سے لگایا جاتا ہے۔ گویا بقول اقبال

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد
زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

مجھ کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

اب وہ زمانے گئے، جب پیروں کی عظمت قرآن و سنت سے گہری عقیدت و تمسک اور افادہ و استفادہ سے عبارت تھی۔ اور شریعت پہ استقامت ان کی سب سے بڑی کرامت تھی۔ سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں

درست العلم حتی صرت قطبا
ونلت السعد من مولی الموالی

ترجمہ: میں نے علم کے ذریعہ مقام قطبیت کو پایا ہے۔ اور اسی علم کی بدولت مالاؤں کا مولیٰ بننے کی سعادت پائی ہے۔

افسوس کہ اب ایسے پیر کہاں! جو پہلے علم پائیں۔ پھر ولی اللہ کہلائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب ایسے پیر خال خال ہیں کہ جنہیں دیکھ کر خدا کی یاد قائم ہو اور دیکھنے والوں کی زندگی میں روحانی انقلاب برپا ہو۔ دراصل یہ سب خرابی اس نظام ملوکیت کی پیدا کردہ ہے۔ جو جہاں بھی قائم ہوتا ہے، عدل و انصاف کا خون کرتا ہے۔ افسوس کہ سیاست، مذہب اور روحانیت بھی اس کا شکار ہوئے۔ خدا وہ دن جلد لائے کہ جب حیات انسانی کے تمام شعبے ملوکیت کی اسیری سے باہر آئیں اور مسلم معاشرہ ایک بار پھر سے آزاد ہو۔'' (۱۲)

اگر کسی پیر سے بیعت ہونے کے بعد معلوم ہو کہ وہ غیر صالح، ناقص، نااہل اور خلاف شرع بدعتی ہے تو اس کی بیعت فسخ کر دینی چاہیے۔ کسی شخص نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص کسی کا مرید ہو جائے اور بعد ازاں اس کو فضول پائے تو کیا وہ بیعت برقرار رکھے یا توڑ دے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے لیے ضروری ہے کہ بیعت فسخ کر دے اور کسی دوسرے کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جنگل میں ہو اور قبلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے اندھیرے میں کسی ایک سمت میں نماز پڑھ چکا ہو اور بعد میں اسے معلوم ہو کہ قبلہ کسی اور طرف ہے۔ تو اسے چاہیے کہ صحیح قبلہ کی طرف نماز پڑھے۔ (۱۳)

تصوف میں بیعت کا عمل بہت ضروری سمجھا جاتا ہے اور اصل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے چند اقسام کی بیعتیں لی ہیں۔ کبھی کسی فعل کے کرنے پر کبھی ممنوعات کے ترک کرنے پر، کبھی ہجرت پر، کبھی جہاد پر، کبھی بیعت عام، کبھی بیعت خاص، کبھی کسی

محبت کا ثمر یہ ہوگا کہ تمہاری شخصیت میں میری صفات منعکس ہو جائیں گی۔ اور اس قرب یا اتصال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم چشم دل میرا دیدار کر سکو گے۔

اسی لیے اہل مذہب دو گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ جن لوگوں پر عقل کا غلبہ تھا۔ انہوں نے صرف اطاعت شریعت کو کافی سمجھا اور جنت کو مقصود بنایا لیکن جن لوگوں پر عشق کا غلبہ تھا۔ انہوں نے اطاعت کے علاوہ محبت (طریقت) کو بھی ضروری سمجھا یعنی دیدار کو مقصود بنایا۔۔۔ دوسرے طبقے کے افراد کو عرف عام میں صوفی کہتے ہیں اور اس تصریح سے یہ معلوم ہو گیا کہ ہر صوفی دراصل عاشق ہوتا ہے عشق اور تصوف مترادف الفاظ ہیں۔

تصوف کیا ہے؟ خدا سے ملنے یا اسے دریافت کرنے یا اسے دیکھنے کی شدید ترین آرزو کا دوسرا نام ہے۔ تصوف کیا ہے؟ روح انسانی کا اپنی اصل (خدا) سے واصل ہو جانے کا اشتیاق۔ یہ جذبہ انسان میں کیسے پیدا ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب اس نے خدا کی طرف سے یہ ندا سنی کہ اگر تم مجھ سے محبت کرو گے تو میں بھی تم سے محبت کروں گا، تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ شے جسے میں روح کہتا ہوں فی الحقیقت خدا سے جدا نہیں ہے۔ بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی سے متصل ہے۔ بالفاظ دیگر خدا اور روح دونوں ہم جنس ہیں اور قاعدہ کلیہ ہے کہ الجنس یمیل الی الجنس۔۔۔ اگر خدا اور میری روح میں باعتبار حقیقت مغایرت ہوتی تو خدا مجھے اپنی ذات سے محبت کا حکم نہ دیتا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ روح اس کے پاس سے آئی ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی ذات میں یا اپنے باطن میں غور کیا تو اسے معلوم ہوا کہ میری روح خود بھی

ا۔ شیدائے جمال مطلق ہے یعنی کسی ایسی ہستی سے محبت کرنا چاہتی ہے جس سے زیادہ جمیل تر یا خوب تر یا حسین ہستی متصور نہیں ہو سکتی۔

۲۔ محبت سے ہمکنار ہونا چاہتی ہے۔

تو اسے یقین ہو گیا کہ میری روح واقعی خدا ہی کے پاس سے آئی ہے کیونکہ اگر خدا مجھ سے محبت کرتا ہے تو میری روح بھی اس سے محبت کرتی ہے۔ یہ ہے وہ مرکزی نقطۂ خیال (جسکی صداقت سالک پر مجاہدے اور مشاہدے کے بعد روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے) جس پر تصوف کا مدار ہے۔

جب انسان خدا کے بجائے دنیا (زن + زر + زمین) کو اپنا مقصود، مطلوب و محبوب بنا لیتا ہے تو قلب و نظر دونوں قوتیں رنجور ہو جاتی ہیں اور اگر مداوا نہ کیا جائے تو بموجب قانون قدرت، وہ دونوں قوتیں مر جاتی ہیں اور ان کے مر جانے سے انسان مر جاتا ہے۔ صرف حیوان باقی رہ جاتا ہے۔

اللہ نے ہر انسان کے اندر (دل میں) اپنی محبت کی شمع روشن کر دی ہے اور ذکر الٰہی بطور روغن ہے۔ اگر روغن ختم ہو جائے تو شمع کا بجھ جانا یقینی ہے۔

تصوف کیا ہے؟ مذہب کی روح ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ مذہب دراصل یعنی اپنی حقیقت کے لحاظ سے زندہ خدا کے ساتھ زندہ رابطہ پیدا کرنے کا نام ہے۔ ارکان، شعائر، مناسک، قواعد، ظواہر، یعنی احکام شرع یہ سب اس رابطے کے حصول کے ذرائع ہیں۔ بالفاظ دیگر یہ سب مقصود بالعرض ہیں نہ کہ مقصود بالذات۔

تصوف ہی وہ رہنما، مشیر اور ناصح ہے، جو ہر وقت انسان (سالک) کو تلقین کرتا رہتا ہے کہ دیکھنا! کہیں مقصود نگاہ سے اوجھل نہ ہو جائے۔ اے انسان! تیرا مقصود حقیقی، اللہ سے رابطہ یا تعلق پیدا کرنا ہے۔ اس لیے جب تو نماز پڑھنے کھڑا ہو اور یہ دیکھے کہ مصلیٰ پاک ہے یا نہیں؟ منہ قبلے کی طرف ہے یا نہیں؟ تو ان ظواہر کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو دیکھ کہ تیرا تصور پاک ہے یا نہیں؟ دل اللہ کی طرف ہے یا نہیں۔۔۔ اگر بحالت نماز تیرا دل دنیا کی طرف ہے تو ایسی نماز بے حضور سے ظاہر شرع کا تقاضا تو پورا ہو جائے گا لیکن اللہ سے تعلق پیدا نہ ہو سکے گا اور جب اللہ سے تعلق پیدا نہ ہوا تو نماز کا مقصود حقیقی بھی فوت ہو گیا۔

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر
(اقبال)

اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

قرآن رہے پیش نظر یہ ہے شریعت
اللہ رہے پیش نظر یہ ہے طریقت

جو شخص کسی مذہب کا پیرو ہے۔ مگر تصوف پر عامل نہیں۔ اسکی مثال اس شخص کی سی ہے۔ جس نے ساری عمر کسی حلوائی کی دکان میں حلوہ بنایا مگر خود کبھی حلوہ نہیں کھایا۔

فقیہ کہتا ہے۔ اے مسلمان اللہ کا نام لے۔ صوفی کہتا ہے کہ اے مسلمان! اللہ کا نام ضرور لے مگر اس طرح لے کہ وہ تیرے دل میں بس جائے۔

تصوف دل کی نگہبانی کا دوسرا نام ہے۔ کیونکہ انسان بظاہر جسم اور نفس کا نام ہے۔ مگر در حقیقت دل کا نام ہے۔ اور اگر دل مسلمان نہ ہو سکا تو رکوع و سجود یا زبان سے خدا کا اقرار دونوں بے معنی ہیں۔

جب تک کوئی شخص "خداوندان دل" کی صحبت اختیار نہیں کرے گا۔ اس وقت تک دل، حقیقی معنی میں دل نہیں بن سکتا۔ اور بات بھی معقول ہے چراغ تو چراغ ہی سے روشن ہو سکتا ہے۔

تصوف کی سب سے بڑی خصوصیت جو اسے دنیا کے دوسرے تمام علوم وفنون سے ممتیز کرتی ہے۔ یہ ہے کہ اسکی بدولت خدا، انسان کا محبوب بن جاتا ہے۔

انسانی زندگی پر تصوف کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں یا تصوف کا ثمرہ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ بخوف طوالت چند اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

۱۔ سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ صوفی (اگر وہ در حقیقت تصوف پر عامل ہے) تمام رذائل اخلاق سے پاک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ تصوف (عشق) تمام انسانی عیوب کا ازالہ کر دیتا ہے۔۔۔ اس جگہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ تصوف میں سارا زور عمل پر دیا جاتا ہے۔ بلکہ تصوف کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقی (عرفان) صرف عمل کے بعد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ پس جو صوفی عمل نہیں کرتا۔ وہ صوفی نہیں ہے بلکہ فلسفی یا متکلم ہے۔

ایک عالم دین صرف تعلیم پر اکتفا کرتا ہے۔ یعنی وہ صرف زبان سے اپنے شاگردوں کو اس بات کا علم عطا کرتا ہے کہ خدا نے تزکیہ نفس کا حکم دیا ہے لیکن نہ وہ انہیں اس کا طریقہ بتاتا ہے نہ عملاً کسی کا تزکیہ کر کے دکھاتا ہے۔ اس کے پاس صرف تھیوری (نظریہ) ہے۔ اور وہ صرف اسی پر اکتفا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ عالم دین رنگ فروش ہے۔ رنگ بیچتا ہے۔ مگر چڑھا نہیں سکتا۔

صوفی بھی تزکیہ نفس ہی کی تلقین کرتا ہے مگر وہ صرف تلقین پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اپنے شاگردوں سے یہ کہتا ہے کہ میرے پاس آؤ، میری صحبت میں بیٹھو، میں بالفعل تمہارے نفس کا تزکیہ کر دوں گا۔ عالم دین نے تمہیں بتایا ہے کہ خدا ہے میں تمہیں دکھا دوں گا کہ واقعی خدا ہے۔

۲۔ تصوف کا دوسرا فائدہ ہے کہ وہ ہر شخص سے محبت کرنے لگتا ہے۔ بقول اقبال

بندہ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق

صوفی کے دل ودماغ سے تعصب، تنگ نظری، نفرت، حقارت، امتیاز رنگ ونسل، فرقہ بندی، گروہ بندی، بیجا پاس داری اور ناحق کوشی یا باطل پسندی کے جذبات بالکل مٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ کسی کو آزار نہیں پہنچا سکتا۔ اس سے کسی کو رنج نہیں پہنچ سکتا۔ انسان تو انسان ہے۔ وہ تو حیوانات پر بھی رحم کرتا ہے۔

خلاصہ کلام این کہ تصوف، انسان کو رذائل اخلاق سے پاک کر دیتا ہے اور اسکی جگہ بہترین اخلاقی صفات سے مزین کر دیتا ہے لیکن اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ یہ تبدیلی مرشد کی صحبت کے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر فن، صاحب فن کی صحبت میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ غواصی، طباخی، نجاری، خوش نویسی، خیاطی وغیرہ ان میں سے کوئی فن کتابوں یا تقریروں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صیقل گری (تزکیہ نفس) بھی ایک فن ہے اور وہ کسی صاحب فن کی نگاہ ہی کی بدولت حاصل ہو سکتا ہے۔ تصوف کی پوری تاریخ ہمارے اس دعوے کی صداقت پر شاہد ہے اور تمام انسانوں کا روز مرہ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ چراغ، چراغ سے روشن ہو سکتا ہے۔ (۱۰)

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری، حقیقت تصوف جلد اول ص ۸۵، ادارہ منہاج القرآن۔ ایم ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ ۱۹۹۰ء

۲۔ لوئیس معلوف، المنجد ص ۴۲۹، مطبوعہ بیروت، ۱۹۷۱ء

۳۔ امام ابوبکر بن اسحٰق۔ تعرف، ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۳۹، المعارف گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۳۹۱ھ

۴۔ خواجہ محمد فخر الحسن ص ۶۸، ترجمہ شاہ حسین گردیزی، دار العلوم مہریہ، صحافی کالونی، گلشن اقبال، کراچی، سنہ اشاعت ندارد

۴۔ شیخ عبدالقادر عیسیٰ۔ حقائق عن التصوف ص ۱۹، ترجمہ مفتی محمد یوسف بندیالوی، زیر اہتمام، احمد حسن قادری، فیڈرل بی ایریا، کراچی، ۱۹۹۳ء

۵۔ ابوالفیض قلندر علی سہروردی، الفقر فخری، ص ۴۷، مرکزی مجلس سہروردیہ، لاہور، سنہ اشاعت ندارد

۶۔ قاضی قیصر الاسلام، فلسفے کے بنیادی مسائل، ص ۳۱۱، نیشنل بک فاؤنڈیشن، آئی آئی چندریگر روڈ، کراچی، ۱۹۷۶ء

۷۔ البقرۃ ۲/۱۵۱۔ الاعراف ۱۳۲/

۸۔ تفسیر ماجدی، حاشیہ زیر آیت البقرۃ ۲/۱۵۱

۹۔ ابوالفیض قلندر علی سہروردی، ص ۵۷

۱۰۔ شمس بریلوی، ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ، کراچی، فروری ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۳

۱۱۔ ایضاً ص ۱۲۵

۱۲۔ روزنامہ جسارت، کراچی، ۵ جنوری ۱۹۹۵ء

۱۳۔ ابوالفیض قلندر علی سہروردی، ص ۳۰

۱۴۔ الکہف، ۲۶

۱۵۔ امام ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب عمری، مشکوۃ، کتاب الایمان، دینی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور، سن اشاعت ندارد۔

۱۶۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی، تاریخ تصوف، ص ۱۵۱تا۱۵۲، علما اکیڈمی، محکمہ اوقاف پنجاب، لاہور، ۱۹۷۶ء

اسلام کا تاسیسی اصول ''تدریج'' اور ملت کی حیاتِ نو

محمد عارف خان ساقی٭

اللہ رب ذوالجلال کا بے پایاں کرم ہے کہ اس نے تمام امتوں میں آخری امت کے اعزاز سے سرفراز فرما کر رہتی دنیا تک کے لئے اپنے مقدس پیغام کی پاسداری اور اس کے فروغ و پرچار کے لئے ہمیں منتخب فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تؤمنون بالله(1)

ترجمہ: تم ہی وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کے لئے میدان عمل میں اتارا گیا ہے تم ''معروف'' (بھلائی) کا حکم دیتے ہو اور ''منکر'' (برائی) سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان بھی رکھتے ہو۔

امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کو یہ عظیم رتبہ ملا ہے تو دو مخصوص حوالوں کے باعث ملا ہے۔ یہ دو حوالے اس کی دو بنیادی ذمہ داریاں ہیں۔ پہلی ذمہ داری ہے انسانی معاشرے میں ''معروف'' کو فروغ دینا۔ اور دوسری اہم ذمہ داری ہے ''منکر'' کا سدباب۔

اس مقدس فرض کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہمارے پیش نظر مسلمانان پاکستان کی معیشت و معاشرت کی تطہیر، یہاں سے برائی کا خاتمہ کرتے ہوئے اس کی جگہ بھلائی کو فروغ دینا اور پوری اصلاح و درستگی کے ساتھ اس کو اسلامیانے کا عمل ہے۔ روایتی اعتبار سے اس کے لئے دو راہیں کھلی ہیں۔ اولاً ''انقلاب'' کا راستہ ہے۔ مگر انقلاب کے فوائد کم اور نقصانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ بہت مرتبہ تو ایسا

٭لیکچرار، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

ہوتا ہے کہ بگھرتے ہوئے ناسور بھی وقتی طور پر اپنا منہ بند کر لیتے ہیں اور پھر ذرا سنبھل کر اندر ہی اندر زہر گھولنے لگ جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ ہی عرصہ میں وہ انقلاب اپنی موت آپ مر جاتا ہے اور قوم صدیوں کسی نئے انقلاب کا صدمہ سہنے کیلئے ذہنی طور پر تیار ہونے کے قابل ہی نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ طریق عمل تو قابل عمل نہیں رہ جاتا ہے۔ رہا دوسرا راستہ تو وہ ہے "تدریج"۔ سطور ذیل میں تدریجی طریق کار کے چند پہلوؤں پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

تدریج کا لفظ درج یدرج درجا سے نکلا ہے۔ درجا کا معنی ہے "مراتب میں ترقی کرنا"(۲) درجہ کا لفظ اسی سے ماخوذ ہے۔ سیڑھیوں کے سلسلے کا ہر زینہ بھی "درجہ" کہلاتا ہے۔ اسی طرح درجہ کا لفظ "رتبہ" اور "مرتبہ" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ درج سے باب تفعیل کا مصدر "تدریج" ہے اور اس کا مطلب ہے: "مراتب میں ترقی دینا" اس باب سے آنے والے کلمے میں چونکہ ٹکڑوں میں بانٹ دینے کا معنی اضافی طور پر شامل ہو جاتا ہے۔ مثلاً انزل کا معنی ہے: "اتارا" جبکہ باب تفعیل سے نزل کا معنی ہے: "تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا"۔ لہٰذا تدریج کا معنی ہے: اپنے مقصود تک کی پوری مسافت کو چھوٹے چھوٹے درجات میں تقسیم کرتے ہوئے منزل بمنزل یا درجہ بدرجہ معاملے کو آگے بڑھانا اور یوں بتدریج منزل مقصود تک رسائی کو کوشش کرنا۔ حافظ محمد سعد اللہ لکھتے ہیں:

"تدریج کا مطلب درجہ بدرجہ اور آہستہ آہستہ کسی چیز کو اس کی انتہا اور کمال تک پہنچانا ہے" (۳)

قرآن حکیم نے اس معنی میں باب استفعال کا کلمہ استعمال کیا ہے اور یہ دو جگہ پر آیا ہے۔ اولاً سورۃ اعراف میں ہے:

والذین کذبوا بایتنا سنستدرجھم من حیث لا یعلمون (۴)

ترجمہ: اور وہ لوگ کہ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، عنقریب ہم ان کو یوں آہستہ آہستہ قریب کریں گے کہ ان کو کچھ پتا بھی نہ چلے گا۔

چند دیگر معروف و متداول تراجم بھی ملاحظہ کیجئے:

ا جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی (شیخ الہند مولانا محمود حسن)

۲ اور جنہوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں جلد ہم انہیں آہستہ آہستہ عذاب کی طرف لے جائیں گے جہاں سے انہیں خبر نہ ہوگی (اعلیٰحضرت فاضل بریلوی)

۳ رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا ہے، تو انہیں ہم بتدریج ایسے طریقہ سے تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی (مولانا مودودی)

دوسری جگہ ہے:

فذرنی ومن یکذب بھذا الحدیث ط سنستدرجھم من حیث لا یعلمون (۵)

ترجمہ: اب میرے حوالے کر دیجئے ان کو جو اس بات کو جھٹلاتے پھرتے ہیں۔ عنقریب ہم ان کو یوں بتدریج آگے بڑھائیں گے کہ ان کو پتا بھی نہ چلے گا۔

اصلاح معاشرہ کے کسی ملک گیر اقدام سے قبل وہاں کے معاشرتی و عمرانی مسائل اور معاشی مشکلات پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہوتا ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی ۔

مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لہٰذا یہ دیکھ لینا اس سلسلے میں یقیناً سودمند ہوگا کہ وہ کیا اسباب و عوامل اور محرکات تھے جنہوں نے لوگوں کو ایک صاف اور سیدھی راہ سے بھٹکا کر غلط کاریوں میں مبتلا کر دیا۔ استعماری تسلط نے تو رہی سہی کسر پوری کی، اصلاً ایک شتر بے مہار کی طرح ہماری معاشرت، اعلیٰ انسانی اقدار سے کافی پہلے آزاد ہو گئی تھی۔ گویا

کچھ تو تیرے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ میری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

چنانچہ ہماری معیشت ہو یا معاشرت زمانہ دراز سے حقیقی اسلامی تعلیمات سے دوری اور ایک حد تک بیگانگی کا شکار ہیں۔ اس کے اسباب و اثرات یوں تو بے شمار طرح کے ہیں مگر ان میں سے حسب ذیل چند پہلو اتنے نمایاں اور ان کے اثرات اتنے گہرے ہیں کہ ان سے صرف نظر کرتے ہوئے کوئی بھی اقدام مطلوبہ نتائج پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

مقامی اثرات

برصغیر میں ہندوؤں کے ساتھ صدیوں پر محیط اختلاط اور میل جول کے باعث ہماری اعتقادی، معاشرتی و معاشی نیز اخلاقی تہذیبی اور تمدنی حالت پر پڑنے والے اثرات کا تعین اور ان کی نشاندہی ضروری ہے۔ صدیوں پر محیط اس ڈراتھ کے باعث جہاں اہل ہند نے مسلمانوں سے بہت کچھ

لیا اور سیکھا وہیں ان کی معاشرت نے ہمارے اوپر بھی بہت گہرے جوابی اثرات ڈالے ہیں۔ ایک غیر محسوس طریقے پر دونوں ایک دوسرے کی روایات کو اپنی اپنی روایات میں ضم کرتے چلے گئے۔ فلموں وغیرہ کی شکل میں موجودہ دور کی ثقافتی یلغار بھی اسی پرانے سلسلے کی ایک تازہ دم کڑی ہے۔ اور رابطہ بحال برقرار رکھے ہوئے ہے۔ وہاں سے آئے ہوئے بہت سے پرانے رسوم و رواج ہماری معاشرت میں کچھ یوں ضم ہو گئے ہیں کہ آج ان کو الگ کرتے اور چھوڑتے ہوئے لوگ گھبراتے ہیں۔ اس میں آدابِ معاشرت اور شادی بیاہ کے طور طریقے، اسی طرح خوشی و غمی کے دیگر موقعوں پر اختیار کئے جانے والے انداز و آداب اور رسوم و رواج، عائلی اور عمومی زندگی سے متعلق معاملات مثلاً دوسری شادی کو بنظرِ عیب دیکھنا اور ایک میاں ایک بیوی کا اصول، مقامی تہواروں مثلاً ہولی اور بسنت وغیرہ کے اثرات شامل ہیں۔

بدیسی اثرات

یہ اثرات عہد غلامی اور انگریزوں کے ساتھ میل ملاپ کا نتیجہ ہیں۔ مسلمانوں میں خواندگی کی انتہائی پست سطح کے باعث بدیسی راج کا ذہنی اور فکری غلبہ سیاسی غلبے سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوا۔ اس میں بعض ایسی چیزیں بھی مستقلاً مسلمانوں میں رائج ہو گئیں جو ان کے اپنے فکر و فلسفہ سے متصادم اور ان کی ضد تھیں۔ مثلاً مطالبہ حقوق پر زور۔ حالانکہ اسلامی فکر کی اساس اس کی بجائے ادائیگی فرائض پر ہے۔ حقوق اور فرائض ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ ہر فرض کی بجا آوری سے کسی نہ کسی کا حق وابستہ ہے۔ اس لئے اسلام اس بات پر زور دیتا ہے کہ فرائض بحسن و خوبی ادا کئے جائیں۔ یوں صاحب حق کا حق بھی بحسن و خوبی ادا ہو جائے گا۔

بالفاظ دیگر اسلام کا مرکز نگاہ فرائض ہیں۔ جبکہ اہل مغرب کی ساری توجہ حقوق اور ان کی ادائیگی کے مطالبہ پر مرکوز ہے۔ اس تبدیلی سے نظام افکار پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور اخلاقی حالت بری طرح تباہ ہو گئی۔ محض ڈیوٹی پوری کر کے فرض کیا جانے لگا کہ فرض ادا ہو گیا۔ مغربی تہذیبی اثرات بھی انہی راہوں سے ہماری معاشرت کا حصہ بنے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں:

انسانی تہذیب کی چار ہزار برس کی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ صرف گزشتہ ڈیڑھ سو برس سے انسانیت، جدید مغربی تصورات کے زیر اثر آئی ہے۔ اس سے پہلے تمام نوع انسانی کے ذہن پر مشرقی تصورات کی حکومت تھی۔ جب سے حیات انسانی اور اس کی جدوجہد مغربی تصورات کے زیر اثر آئی ہے، اس وقت سے آج تک مجموعی ہلاکت جو انسان کے لئے پیدا ہوئی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے جتنی اس ڈیڑھ سو برس کے علاوہ باقی چار ہزار برس میں پیدا ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانیت اپنے

مفادات کی بناء پر گروہوں میں بٹ گئی ہے اور یہ گروہ فرائض کے حوالے کے بغیر مطالبۂ حقوق کی اساس پر منظم ہوئے ہیں مگر فرائض کے حوالے کے بغیر مطالبۂ حقوق تصادم کی دعوت کے مترادف ہے۔ اس لئے مطالبۂ حقوق پر منظم ہونے والا ہر گروہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہے یا اس کے لئے تیار ہو رہا ہے حالانکہ زندگی تعاون کا عمل ہے اور اس کے تقاضے عطا و قبول سے پورے ہوتے ہیں اور فرائض کے حوالے کے بغیر حقوق کا نعرہ زندگی کی اس فطرت کے خلاف ہے جس پر اسے وضع کیا گیا ہے۔ لہٰذا کوئی مشترک زاویہ نگاہ پیدا نہیں ہو سکتا اور تضاد و کشمکش اور تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے(۲)

صدیوں پر محیط ناخواندگی کا دور

اس کے نتیجے میں جہالت عام ہوئی اور حق پسندی کی جگہ ضد اور ہٹ دھرمی نے لے لی۔ دلیل کی تاثیر جاتی رہی اور "زور و زبردستی" مقابل کرنے کا بہترین اور موثر ہتھیار بن گئے۔ اس آفت نے جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا اس کی نوعیت ذرا دوسری اور کسی قدر غور کی متقاضی ہے۔ سیاست فرمانروا ہو گئی اور دین محض ایک درباری کا کردار ادا کرنے پر کہیں مامور اور کہیں مجبور ہوا۔ علمی تحقیقات و تدقیقات اور نئی ایجادات کا ذوق ناپید ہو گیا۔ اسلامی تعلیمات کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور کرتے رہنے کا کام بالکل رک گیا اور مدتوں رکا رہا۔ آج جب ہم اسلامیانے کے عمل کی بات کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ صرف ایمانیات اور اعتقادات کا باب غیر متبدل ہے جس میں انسانی عقل کو مداخلت کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ معاملات اور ان کے پیمانے حالات و زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور ایک عرصہ دراز کے انجماد کے بعد انہی پرانے پیمانوں اور باٹوں سے نئے مسائل کو ناپنے اور تولنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ایک بے سود عمل ہے۔ یہ ایک طرح سے ایک نومولود کے بچے ہوئے کپڑے اس کے عالم شباب میں اسے پہنانے کی کوشش کے مترادف ہے۔ اس باب میں کرنسی اور معیشت کے مسائل نمایاں تر ہیں۔

قبائلیت

ہمارا عمومی ماحول و مزاج اور ہمارے یہاں کی بنیادی اقدار اسلامی سے زیادہ قبائلی نوعیت کی ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنے عہد اقدس میں قبائلی عصبیتوں اور منافرتوں کا خاتمہ فرما کر بنی نوع انسان کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ قبائلی امتیازات کا گھن اس معاشرے کو بھی بری طرح چاٹ رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فضیلت و برتری کے حقیقی اور قدرتی معیار کو اجاگر کرتے ہوئے، آباء و اجداد اور حسب و نسب پر

فخر سمیت عزت و ذلت کے حوالے سے لوگوں کے خود ساختہ جملہ معیارات اور ان کے نتیجے میں قائم ہونے والے امتیازات کا خاتمہ فرما دیا:

أيها الناس ! ان ربكم واحد ، وان اباكم واحد ، كلكم لآدم و آدم من تراب ۔ اكرمكم عندالله اتقاكم ،ان الله عليم خبير ۔ ألا لافضل لعربى على عجمى ولا لعجمى على عربى ولا لاسود على احمر ولا لاحمر على اسود ، الا بالتقوى (۷)

ترجمہ: لوگو ! یقیناً تمہارا رب ایک ہے، اور یقیناً تمہارا باپ بھی ایک ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ اللہ کی بارگاہ میں تم میں سب سے زیادہ عزت اس کی ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بہت جاننے والا، بہت باخبر ہے۔ خبردار ! کسی عربی کا کسی عجمی پر اور کسی عجمی کا کسی عربی پر اسی طرح کسی سفید فام کا کسی سیاہ فام پر اور کسی سیاہ فام کا کسی سفید فام پر فضیلت و برتری کا ہر دعویٰ باطل ہے۔ ہاں مگر تقویٰ کے طفیل۔

اسی طرح آپ ﷺ نے جاہلیت کے سارے دستور بھی باطل کر دیے تھے:

الا كل شىء من امر الجاهلية تحت قدمى موضوع (۸)

ترجمہ: جاہلیت کے ہر دستور کو کچل دیا گیا ہے۔

مگر یہ صورتحال زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ پائی۔ کچھ ہی عرصے میں قبائلیت نے اسلامی تعلیمات میں اپنے جواز کے پہلو ڈھونڈ نکالے۔ خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد اس کو ترقی کے لئے بہت سازگار ماحول میسر آیا اور خوب پھلی پھولی۔ ڈاکٹر محمد صدقی، اسلامی سیاست و معاشرت میں عصبیت جاہلیہ کی واپسی اور پھر سے اثر و نفوذ پیدا کر لینے اور ماحول پر چھا جانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

كانت نهاية الخلافة الراشدة واستحكام الدولة الاموية التى كانت عربية أكثر منها اسلامية ، وكانت ملكا أقرب منها خلافة ،كانت انتقالا جديدا فى تاريخ الاسلام و فرصة انتهزتها الجاهلية التى كانت بالمرصاد، فعاشت النزعات الجاهلية التى قضى عليها الاسلام و عادت العصبيات القبلية والنخوة الجاهلية التى نعاها النبى ﷺ بقوله : ان الله قد أذهب عنكم النخوة الجاهلية تعظمها بالآباء. (۹)

ترجمہ: خلافت راشدہ کا اختتام اور دولت اُمویہ کا استحکام، جو کہ اسلامی سے زیادہ عربی مزاج کی حامل تھی اور خلافت سے زیادہ ملوکیت تھی، تاریخ اسلامی کی ایک نئی قلابازی تھی۔ یہ ایک ایسا موقع تھا کہ جسے جاہلیت نے، جو کب سے گھات لگائے تاک میں بیٹھی تھی، بہت غنیمت جانا۔ اس کے نتیجے میں قبائلی

تنازعات، جنہیں اسلام نے دفن کر دیا تھا، پھر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ قبائلی عصبیت اور عہد جاہلیت کی نخوت بھی واپس آ گئی جس کی موت کی اطلاع نبی اکرم ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی: "یقیناً اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کی نخوت اور اس کا خاصہ آباؤ اجداد پر فخر و غرور تم سے دور کر دیا ہے۔

آج بھی ہماری معاشرت بنیادی طور پر قبائلی ہی ہے۔ بلکہ قبائلیت، عہد بنی اُمیہ کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ راسخ ہو چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے دھوکے میں رکھنے کے لئے شریعت اسلامی کی چادر کی اُنگل مار رکھی ہے اور اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اس کا اندرونہ اور بیرونہ ایک نہیں۔ حتیٰ کہ کوئی بھی قضیہ آج پیش آ جائے، ہم اس کا حل پہلے اپنی قبائلی اقدار و روایات کی روشنی میں ہی تلاش کرتے ہیں۔ کوئی اور چارہ نہ بچے تو دیگر ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ اپنے معاملات کو اسلامی اصولوں کا پابند رکھنے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انہیں جانچنے پرکھنے کی نوبت کم ہی آتی ہے۔

فرقہ وارانہ کشیدگی

فرقہ وارانہ کشیدگی کے باعث خود مسلمان بھی اسلام کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے۔ اقوام عالم کے مقابلے پر کمزور پڑتے گئے اور ہوتے ہوتے ان کی ہوا تک اکھڑ گئی۔ قرآن مجید نے فرقہ واریت سے متعدد مقامات پر اور مختلف پیرایوں روکا ہے:

يايها الذين امنوا اتقوا الله حق تقته ولا تموتن الا وانتم مسلمون ○ واعتصمو ابحبل الله جميعا ولا تفرقوا ص واذكرو انعمت الله عليكم اذ كنتم اعداء فالف بين قلوبكم فاصبحتم بنعمته اخوانا ج وكنتم على شفاحفرة من النار فانقذكم منها ط كذلك يبين الله لكم ايته لعلكم تهتدون (۱۰)

ترجمہ: اے ایمان والو ! ڈرتے رہو اللہ تعالیٰ سے جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور مرنا تو اسلام پر ہی مرنا۔ اور بچالو اپنے آپ کو سب اللہ تعالیٰ کی رسی سے وابستہ رہ کر اور تفرقہ بازی مت کرنا، اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو باہم گرجوڑ دیا تو تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے، اور تم آگ کے ایک گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ اس نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو تا کہ تم راہ راست پکڑو۔

واطيعوا الله و رسوله ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب ريحكم واصبروا ط ان الله مع الصبرين (۱۱)

ترجمہ: اور اطاعت گزار رہو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے اور آپس میں مت جھگڑو کہیں تم کمزور ہو جاؤ اور تمہاری ہوا بھی اکھڑ جائے اور صبر کرتے رہو، یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

امت کی وحدت کو قائم رکھنے اور دین کو ٹکڑے ٹکڑے نہ کرنے کے بارے میں ارشاد ہے:

وان ھذہ امتکم أمة واحدة و انا ربکم فاتقون ○ فتقطعوا امرھم بینھم زبرا ط کل حزب بما لدیھم فرحون ○ فذرھم فی غمرتھم حتی حین (۱۲)

ترجمہ: اور یقیناً تمہاری یہ اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پھر مجھی سے ڈرو۔ بعد ازیں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے انہوں نے آپس میں بانٹ لیا، ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی پہ خوش ہے۔ تو رہنے دیجئے ان کو اپنی اسی مستی میں ایک وقت تک۔

ان واضح اور روشن تعلیمات کے باوجود فرقہ واریت ملی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تو اس کی وجہ شعوری کمی اور جہالت و نادانی کی فراوانی ہی ہو سکتی ہے۔ اس دور میں اسلام کو فرقہ وارانہ اشتعال انگیزی اور منافرتوں سے جو خطرات لاحق ہیں، باقی تمام خطرات یکجا ہو کر بھی اس ایک کے ہم پلہ تو کیا اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہو سکتے۔ بہر حال یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں، اپنے قومی وقار اور اپنی آئندہ نسلوں کی قیمت پر کر رہے ہیں۔

معروضی حالات

آج ہمارے ماحول و معاشرے کی عمومی صورتحال کچھ ایسی ہی ہے کہ لوگ محض ظن و تخمین پر اپنے افکار کی بنیاد رکھ لیتے ہیں اور پھر ان کی ساری زندگی انہی افکار کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ خواندگی کی سطح بہت نیچی ہے۔ مگر شعوری سطح اس سے بھی پست تر ہے۔ پڑھا لکھا کہلانے والے افراد میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ وہ پڑھے لکھے ہیں اور ہر حال میں وہ پڑھے لکھے ہی رہیں گے۔ دنیا و مافیہا سے بیگانہ و لاتعلق اور بے خبر رہتے ہوئے بھی اور مطالعہ اور تحقیق کے بغیر بھی۔ کیونکہ ان کے پاس اعلیٰ تعلیم کی ڈگری آ گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے افراد کی بھاری اکثریت کچھ ایسا ہی مزاج بنائے ہوئے اور کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہے کہ کامیابی کے لئے اہلیت شرط کا درجہ نہیں رکھتی کامیابی کی شرط بااثر افراد میں مقبولیت ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے مطالعہ و تحقیق سے زیادہ عوامی روابط کو فروغ دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے ایسے مظاہرے بھی عام ہیں۔ جس کی وجہ سے نئی نسل کا ذہن بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ عددی برتری کے باعث پورے ماحول و معاشرے پر ان افراد کے گہرے اثرات

ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے مراکز میں بھی اہلیت کو ہنوز اس کا جائز اور حقیقی مقام نہیں مل سکا ہے۔ راہ حق پر استقامت کا حوصلہ رکھنے والے بے بسی کے عالم میں تماشا دیکھتے دیکھتے پتھرا سے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بات ذہن نشین کرنی اور اوروں کو بھی کروانی ہوگی کہ آج اعلیٰ تعلیم کی ڈگری تعلیم یافتہ کی بجائے حصول علم کے قابل بناتی ہے اور حقیقی معنوں میں پڑھا لکھا شخص بس وہی ہے جو ڈگری کے حصول کے بعد بھی اپنے آپ کو پڑھائی لکھائی کے عمل سے مسلسل وابستہ رکھتا ہے۔ اور مطالعہ و کتاب کے ذریعے اپنی فکر کو تازہ دم اور صحت افزا غذا کی فراہمی مسلسل جاری رکھتا ہے۔ اس طریقے پر ہی انسان کی فکری صلاحیتیں تازہ دم، صحتمند اور جوان رہ سکتی ہیں۔ فکری صلاحیتوں کو جلا بخشنے والے اساتذہ خواہ کتنے ہی قابل کیوں نہ رہے ہوں اور سوچ و فکر کے ہیرے کو تراشنے کے عمل میں خواہ کتنی ہی مہارت کا انہوں نے مظاہرہ کیوں نہ کیا ہو، مطالعہ و تحقیق سے دور ہو جانے اور دور رہنے کے بعد ان اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی فکر کا بیمار، فرسودہ، از کار رفتہ ہو جانا یقینی ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ایک اچھا بھلا ہوشمند اور سمجھدار انسان کسی رنگ برنگی تقریب کے دوران بے خبر ہو کر سو جائے اور اٹھنے کے بعد اس تقریب میں ہونے والی سرگرمیوں کے بارے میں اوروں سے سرسری طور پر کچھ سن سنا کر ان سرگرمیوں کی اونچ نیچ پر اچانک تبصرہ شروع کر دے تو اس کے تبصرے میں وہ جان نہیں ہوگی جو کسی بیدار اور بیدار مغز رہ کر پوری تقریب کا مسلسل جائزہ لیتے رہنے والے شخص کی گفتگو میں ہوگی۔ معاشرے پر اس خرابی کا ایک مضر اثر یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں کے لوگوں کی اکثریت اگر رہنمائی لیتی بھی ہے تو ایسے ہی افراد سے لیتی ہے جن کی اپنی سوچ و فکر تازہ دم نہیں ہوتی۔ یہ وہ بنیادی وجہ ہے جس کی طرف لوگ دھیان دینے کی زحمت نہیں کرتے اور اس کی وجہ سے ہمارے یہاں کی عمومی اور قومی سوچ و فکر اور شعوری ترقی کی رفتار بہت سست ہی رہتی ہے۔ دوسری اقوام کے لگ بھگ نصف صدی پرانے اور متروک سماجی رویوں اور افکار و نظریات کو ہمارے یہاں خوب پذیرائی ملتی ہے اور بڑے زور و شور سے ان سماجی تجربات کی وکالت تک کی جاتی ہے۔ تو اس کا بھی ایک بنیادی محرک یہی ہے۔

اس طرح کے بہت سے عوامل نے مل کر ہر آدمی کو ایک خود حفاظتی دفاعی خول میں بند کر دیا ہے۔ لوگوں کی اپنی دانست میں یہ ایک طرح سے ان کی بقا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ بقا کا درجہ اصلاح سے پہلے ہے۔ یا بالفاظ دیگر باقی بچیں گے تو ہی تو اصلاح ہوگی اور اگر باقی ہی نہ بچے تو اصلاح کیسی؟ اس کیفیت سے دوچار افراد اور قومیں ہر تبدیلی کو شک کی نظر سے دیکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔ اور برتنے یا پرکھنے کی بجائے اس سے نفرت کرتی ہیں۔ یوں اپنا بیشتر وقت ایک خود ساختہ دفاعی اور

حفاظتی خول میں بند رہ کر گزار دیتی ہیں۔ اس خول کو "جہالت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں بات حق اور دلیل کی نہیں ضد اور ہٹ دھرمی کی ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر معاشرے میں رہنے بسنے والے افراد کی ایک بھاری اکثریت اسی طرح کے خول میں بند ہے اور وہ سمجھتی ہے کہ تبدیلی حالات سے ان کے وجود اور ان کی بقا کو خطرات لاحق ہیں تو سمجھنا چاہئے کہ یہ عہد، عہد جاہلیت جدیدہ ہے۔ اور ہم پوری طرح ایک عہد جاہلیت کی دلدل میں پھنسے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ صورتحال چند صدی قبل پورے عروج اور شباب پر تھی۔ پورے عالم اسلامی پر استعماری راج مسلط تھا۔ اور ایک جونک کی طرح عالم اسلامی کی رگوں سے رہی سہی توانائی بھی چوس رہا تھا۔ مگر پھر حالات نے پلٹا کھایا اور مسلمان بیدار ہونا شروع ہو گئے۔ درس گاہیں پھر سے آباد ہونے لگیں۔ یہ ایک طرح سے نوزائدگی کا زمانہ ہے۔ آج سند یافتہ علماء کے ساتھ ساتھ حفاظ کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ اعلیٰ اسلامی اور انسانی اقدار وروایات کو اپنے ذاتی اور عارضی مفادات پر ترجیح اور اہمیت دینے کی ہمت اور حوصلہ رکھنے والے افراد کی تعداد میں روز بروز اور خاطر خواہ اضافہ ہو رہا ہے۔ اور بہت سے لوگ جاہلیت کے تراشے ہوئے دفاعی حفاظتی خول سے باہر نکلنے پر آمادہ ہیں۔ لہٰذا ملت کی حیات ثانیہ یا نشاۃ ثانیہ کے لئے مناسب حکمت عملی وضع کرنے کے لئے یہ ایک مناسب ترین موقع ہے۔ کیونکہ حالات کافی سازگار اور بہتری کی طرف مائل ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح چونکہ تاریخ میں یونان کی وثنی تہذیب کے احیاء کے لئے استعمال ہوئی ہے اس وجہ سے معروف مفکر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے نزدیک احیائے اسلام کے معنی میں موزوں نہیں ہے۔ کیونکہ نہ اسلام پر موت طاری ہوئی اور نہ ہی اس کو نئی زندگی کی ضرورت ہے(۱۳) یہ بات اپنی جگہ وزن رکھتی ہے۔ مگر ہمارا مقصود نشاۃ ثانیہ سے احیائے ملت اسلامی ہے نہ کہ احیائے اسلام۔ ڈاکٹر احسان حقی کے بقول:

موت جن پر طاری ہوئی ہے وہ مسلمان ہیں اور وہی نشاۃ ثانیہ کے بھی محتاج ہیں۔ مسلمانوں کی موت سے مراد ان کا دینی تعلیمات کو چھوڑ دینا ہے(۱۴)

اس نشاۃ ثانیہ کے لئے شریعت اسلامی کے اصول تدریج سے بہتر کوئی اور حکمت عملی نہیں ہو سکتی۔ اس کی تائیدات ہمیں عہد اقدس کے مسائل ومشکلات اور شریعت اسلامی کی جا بجا بکھری ہوئی تصریحات سے بھی ملتی ہیں۔ اور ملت کے مجدد اول حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے بھی۔ ڈاکٹر محمد صدقی بن احمد آپ رضی اللہ عنہ کی حکمت عملی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

انه رأى أن الناس قد استمرأوا الباطل و استطابوا الخبيث ، ولم يفرقوا بين الحلال و

الحرام ، وطال عليهم الزمن في هذه الحمأة فاعتادوا روائحها الكريهة واستلذوا نتنها ، فليس من الخير أن يخرجوا منها دفعة واحدة الى جنة مسك و روضة أزهار و ورود ، فليس الا أن يخرجوا رويدا رويدا و تقطع صلتهم بتلك الحمأة شيئا فشيئا(۱۵)

ترجمہ: آپ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ باطل لوگوں کو راس آ گیا ہے، ناپاکی اور پلیدی کو پاکیزگی سمجھنے لگ گئے ہیں اور انہوں نے حرام اور حلال کے درمیان فرق کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس دلدلی کیچڑ میں انہوں نے ایک مدت دراز گزار دی ہے جس کے نتیجے میں وہ اس کی بدبوؤں کے عادی ہو گئے ہیں اور اس کے تعفن سے محظوظ ہونے لگے ہیں۔ تو اب بھلائی اس میں نہیں کہ یکبارگی ان کو اس سے نکال کر خوشبوؤں میں بسے ہوئے کسی گلزار میں پہنچا دیا جائے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ انہیں آہستہ آہستہ اس سے نکالا جائے اور دھیرے دھیرے ہی ان کا اس دلدلی کیچڑ سے رابطہ منقطع ہو۔

حالانکہ وہ عرصہ نصف صدی سے بھی کم تھا جس پر امت کے مجدد اول نے اس قدر رعایت برتی۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ڈھائی سال کی مختصر سی مدت میں پورے معاشرے سے بغاوت وسرکشی، ظلم وجور، من مانی اور بے راہ روی، شراب نوشی و بے حیائی سمیت ہر طرح کی سیاسی، سماجی، معاشی معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی بے اعتدالیوں کا خاتمہ فرما کر عہد خلافت راشدہ کا نظام بحال کر دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ خود نام نہاد مسلمانوں کو یہ تبدیلی کچھ زیادہ راس نہ آئی اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کو زہر دے دیا گیا۔ اس طرح یہ مرد حق آگاہ صرف انتالیس (۳۹) برس کی عمر میں ہی داعی اجل کو لبیک کہہ گیا۔ اتنی بڑی قوم کے دامن میں اگر صرف ایک ہی عمر بن عبدالعزیز ہو گا تو اس قوم کا جو انجام ہونا چاہئے وہ آپ کے بعد بالکل ویسا ہی ہوا۔ اس عظیم عطیہ خداوندی کی ناقدری کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب تیرہ صدیاں بیت چکی ہیں مگر قوم کو پھر کوئی ایسا شخص آج تک نصیب ہی نہیں ہوا جسے اخلاص وللٰہیت اور بھرپور دینی بصیرت کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار اور قوت نافذہ پر مکمل غلبہ اور استحکام بھی حاصل رہا ہو۔

اصول تدریج

ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ قدرت کے کارخانے میں ہر چیز درجہ بدرجہ نمو پذیر ہوتی، آہستہ آہستہ پروان چڑھتی، اپنی حیات طبعی کا زینہ بزینہ طے کرتے ہوئے قدم بقدم آگے بڑھتی، رفتہ رفتہ زور پکڑتی اور دھیرے دھیرے مائل بہ زوال ہو کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ یہی تدریج ہے۔ یہ اصول شریعت اسلامی کا ایک بنیادی اور تاسیسی اصول رہا ہے۔ انقلاب اوپر سے مسلط ہوتا ہے اور اس کے اثرات بھی سرسری

اور سطحی ہی ہوتے ہیں جبکہ تدریجی طور پر لائی جانے والی تبدیلی کے اثرات بڑے گہرے اور دور رس ہوتے ہیں۔ یہ طریق کار اپنے زیر اثر پروان چڑھنے والی کسی بھی چیز کی ہیئت اور ساخت تک کو متاثر کرتا ہے۔ موثر، تاثیر اور متاثر میں مکمل مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرتا اور ان میں ایک معنویت اور اعتدال و توازن لاتا اور برقرار رکھتا ہے۔

تمام تر قوت و تصرف کی خالق و مالک ہستی نے بھی اپنے اس کارخانے میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوئی روایت نہیں چھوڑی۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ انڈے سینے کے عمل میں جدید مشینیں دور مرغیوں کی خدمات سے ہمیں مستغنی اور بے نیاز کردے اور کوئی مشین یہ فریضہ سرانجام دے ڈالے۔ مگر لگیں گے وہی بائیس تیئیس روز۔ مشینوں سے یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ انڈے کے اندر موجود چوزے کی جسمانی ہیئت و ساخت کو برق رفتاری سے مکمل کردیں۔ نبی رحمت ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی کئی خصوصیات ایسی ہیں کہ جو اس کو دیگر شریعتوں سے نمایاں اور ممتاز کرتی ہیں۔ انہی میں سے ایک اصول تدریج بھی ہے۔ نوع بنوع مسائل ومشکلات میں گھرے ہوئے اور بے شمار معاشی، معاشرتی، سماجی اور عمرانی خرابیوں میں بری طرح پھنسے ہوئے لوگوں کو بتدریج ان علتوں کے چنگل سے نکال کر ایک نئے، پاکیزہ اور ایک صاف و شفاف معاشرتی ماحول سے مانوس کردینا کسی ریتلے صحرا میں جوئے شیر رواں کردینے کے مترادف عمل ہے۔ اصول تدریج درحقیقت ایک عظیم نعمت خداوندی ہے۔ اور یہ جملہ احکام شرعیہ کے عملی نفاذ کے عمل میں حضور رسالت مآب ﷺ کی شان رحمت للعالمین کا بین ثبوت اور اظہار ہے۔

اصول تدریج کے معاملے میں مفسرین کرام بالعموم کم ہی توجہ دیتے ہیں۔ شراب کو بتدریج حرام قرار دیے جانے کا معاملہ قرآن مجید میں نہایت واضح ہے۔ اباحت سے حرمت تک کے ان مراحل میں چونکہ کسی کے لئے کسی طرح کی تطبیق ممکن نہیں تھی، لہذا سب کو یہ ماننا پڑا کہ شراب بتدریج حرام ہوئی۔ دیگر احکام ومسائل میں اس پہلو پر پوری توجہ نہیں دی گئی جس کے باعث مفسرین کرام کے نزدیک قرآن مجید میں جابجا تعارض کا گمان بھی پیدا ہوا اور مطابقت پیدا کرنے کی اپنی سی کوششیں کی گئیں۔ یوں معاملہ الجھتا اور مزید بوجھل ہوتا چلا گیا۔ جس طرح ایک بچے اور بوڑھے کو ایک درجے میں نہیں رکھا جاسکتا اسی طرح ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا بھی درست نہیں ہوسکتا۔ یونہی تمام نصوص قرآنی پر یکبارگی عمل اباحت کو حرمت اور حرمت کو اباحت کے ہم پلہ قرار دیے بغیر ممکن نہیں ہے۔ عرب معاشرے سے اور بہت سے گھناؤنے جرائم کا خاتمہ بھی اسی طرح بتدریج ہوا جس طرح شراب کو بتدریج حرام کیا گیا۔ الٰہی ازل سے اللہ رب ذوالجلال کے لائق شان اکمل و اتم ہے۔ اس میں کسی کمی بیشی کی کوئی گنجائش

نہیں۔ لہذا شراب کا ام الخبائث ہونا علم الٰہی میں ازل سے مقدر تھا۔ مگر آہستہ آہستہ اس امر کا انکشاف اور حکم الٰہی کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اسی طرح مثلاً بدکاری بھی سماجی برائیوں میں سب سے قابل نفرت برائی تھی۔ اس کے باوجود یہ حضور اکرم ﷺ کی شان رحمت للعالمین کا اثر ہے کہ آپ کی شریعت مطہرہ نے دھیرے دھیرے اس گندگی کے بری طرح عادی افراد کو اس کے اثر سے آزاد کیا۔

حرمت شراب کے تدریجی مراحل

اتنا تو معلوم ہے کہ عرب شراب کے رسیا تھے۔ ان کو اس علت سے چھٹکارا دلانا وحی الٰہی کو مقصود تھا۔ اس عمل کے لئے جو حکمت عملی وضع کی گئی وہ تدریج پر مبنی تھی۔ آج کے جدید طبی علوم اور مہارتیں بھی اس امر پر متفق ہیں کہ ایک ہیروئن کے عادی شخص کی صحت وسلامتی کو لاحق خطرات میں ایک نمایاں خطرہ یہ بھی ہے کہ دفعتاً اس کے نشہ کرنے پر پابندی لگادی جائے۔ نشہ اور عادت دراصل پکے رنگ ہیں جو چھڑائے نہیں چھوٹتے۔ چنانچہ ایسے مریض کو طبی نگرانی اور حفاظت وتحویل میں رکھ کر پہلے اس کی جسمانی و ذہنی تطہیر کی جاتی ہے۔ پھر غیر محسوس طریقے پر نشہ آور شئے کی مقدار میں کمی کا عمل شروع کیا جاتا ہے۔ نشہ آور شئے کی مقدار میں کمی سے پیدا ہونے والا خلا مناسب غذائی عمل سے حاصل ہونے والی قوت مدافعت پر کرتی رہتی ہے۔ مریض کی حالت کے پیش نظر اس کام میں خاصا عرصہ بھی لگ سکتا ہے۔ یوں کم کرتے کرتے اس کی مقدار کو صفر تک لایا جاتا ہے۔ پھر اس امر کو یقینی بنانے کے لئے کہ مریض کہیں دوبارہ نشے کی طرف نہ چلا جائے، مزید کچھ عرصے تک اس کی نگرانی کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے۔ تب اس کی بصحت وعافیت اس علت سے گلوخلاصی ممکن ہو پاتی ہے۔

پہلا مرحلہ

چنانچہ پہلے پہل ان لوگوں کی ذہنی تطہیر پر ہی توجہ مرکوز رکھی گئی۔ بس اس قدر بتایا گیا کہ نشہ صحت افزا سرگرمی نہیں نہ ہی نشہ کوئی اچھی چیز ہے۔ ساتھ ہی اہل فہم ودانش کو اس معاملے پر مزید غور وفکر کی دعوت دے کر بات کو سمیٹ دیا گیا۔ یہ تو آج ہمیں معلوم ہے کہ شراب حرام ہوگئی تھی، جب یہ پہلا حکم نازل ہوا اس وقت کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ معاملہ یہیں پر ختم کردیا جائے گا یا اس کو آگے بڑھایا جائے گا۔ اور یہ کہ آگے بڑھائے جانے کی صورت میں آگے چل کر یہ کون سی شکل اختیار کرے گا۔ ان حالات میں پہلی آیت مبارکہ نازل ہوئی:

ومن ثمرات النخيل والاعناب تتخذون منه سكرا و رزقا حسنا ط

ان فی ذلک لاٰیۃ لقوم یعقلون (۱۶)

ترجمہ : یونہی کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں میں سے بھی ہم تمہیں پینے کی ایک چیز مہیا کرتے ہیں جس میں سے کچھ کو تم نشہ آور بنالیتے ہو اور کچھ کو پاکیزہ رزق، یقیناً اس میں عقل والوں کے لئے نشانی ہے۔

علامہ ابوبکر الجصاص اس آیت کے تحت فرماتے ہیں،

ان الاٰیۃ اقتضت اباحۃ السکر (۱۷)

ترجمہ : اس آیت کا اقتضاء نشے کی حلت واباحت ہے۔

آیت مبارکہ میں سکرا و رزقا حسنا کے درمیان واؤ مغایرت کے لئے ہے۔ اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ شراب کو اچھی اور صحت بخش غذا کی فہرست سے خارج سمجھا جائے اگرچہ ہے حلال اور اس کے پینے پلانے پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ مزید برآں اہل خرد اور اصحاب فہم ودانش کو اس بات پر غور وفکر کی دعوت دے کر بات ختم کردی گئی۔

دوسرا مرحلہ

اگلے مرحلے میں شراب اور جوئے کو شرعی جرم وعیب کی بجائے ایک معاشرتی اور سماجی برائی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ اور معاشرتی وحدت ویگانگت پر پڑنے والے ان چیزوں کے مضر اثرات کی طرف متوجہ کیا گیا۔ آیت مبارکہ نازل ہوئی:

انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العداوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون ○ واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واحذروا ج فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین (۱۸)

ترجمہ : شیطان تو چاہتا ہی یہی ہے کہ شراب اور جوئے کے معاملات میں تمہارے درمیان عداوت اور بغض کی تخم ریزی کردے اور تمہیں یاد الٰہی اور نماز سے روک کر رکھے، تو کیا تم باز آنے کے ہو؟ اور اطاعت گزار رہو اللہ تعالیٰ کے اور اطاعت گزار رہو رسول اکرم ﷺ کے اور محتاط رہو، اور اگر تم نے روگردانی کی روش اختیار کی تو تم یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کی ذمہ داری تو بس اسقدر ہے کہ کھلے الفاظ میں پیغام پہنچادے۔

اس حکم کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کراہت تو طبعی نوعیت کی ہوگی البتہ ان سرگرمیوں کے

کچھ اثرات مذہبی ودینی معاملات پر بھی پڑتے ہیں جس سے شرعی عیب وگناہ کی طرف راہ نکلتی ہے۔ اس موقع پر یہ سوال بھی کیا گیا کہ دینی نقصان کی اطلاع ملنے کے بعد کیا تم اس سرگرمی کو ترک کرتے اور اس سے باز آجانے پر اپنے آپ کو آمادہ وتیار پاتے ہو؟ یہ اس کاروبار سے اپنا سرمایہ نکال لینے کی ایک زبردست تحریک اور لوگوں کے لئے نہایت قیمتی موقع تھا۔

یہ دونوں آیات سورۂ مائدہ میں آیت تحریم کے سیاق میں ایک ساتھ آئی ہیں جس سے حضرات مفسرین کرام کو یہ گمان ہوا کہ شراب کو حرام قرار دیے جانے کے بعد ان میں حرمت کی وجوہ حکمت بیان کی گئی ہیں۔ مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ دونوں آیات، آیت تحریم خمر سے قبل نازل ہوچکی تھیں۔ اور اس کا ثبوت پہلی آیت مبارکہ کے اختتامی کلمات میں یہ سوال ہے کہ کیا تم شراب اور جوئے سے باز آنے پر آمادہ ہو۔ ظاہر ہے کہ حرمت کا حکم آجانے کے بعد اس سوال کی کوئی وقعت نہیں رہ جاتی۔ یہ زمانی چونکہ ظرفیت کے لئے آتا ہے اس لئے اس سے بھی یہی اشارہ ملتا ہے کہ جب یہ آیات مبارکہ نازل ہوئیں اس وقت لوگ ان علتوں میں مبتلا تھے۔ اور کسی قسم کی کوئی بندش عائد تھی۔ علاوہ ازیں ان آیات کے کلمات سے بالکل واضح ہے کہ ان کی شان نزول کوئی ایسا واقعہ بنا ہے جس کے باعث مسلمانوں میں باہم عداوت پیدا ہوئی، ایک دوسرے کے بارے میں دلوں میں میل آیا، کہیں کسی کے یاد الٰہی اور نماز سے محروم رہنے کا عمل مشاہدے میں آیا اور صلح صفائی کی کوشش میں کوئی ایسی بدمزگی پیدا ہوئی یا کسی کی زبان پر ایسے کلمات آگئے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا دعویٰ رکھنے والا کوئی شخص زبان پہ نہیں لاسکتا اور نہ ہی اسے کسی طرح اس امر کی اجازت ہی دی جاسکتی ہے۔ اس پر رویے اور طرز عمل کو درست رکھنے اور محتاط رہنے کا حکم دیا گیا۔ یہاں یہ پہلو خاص طور پر لائق توجہ ہے کہ ان تمام باتوں کا صدور کسی اہم شخصیت سے ہوا۔ جس کے بارے میں یہ امکان بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ اس سمجھ کو اپنی توہین خیال کرے اور روگردانی کی راہ پر آجائے۔ چنانچہ یہ بھی واضح فرمادیا گیا کہ ہمارے رسول ﷺ کے ذمہ تو پیغام حق کی تبلیغ تھی، سو یہ کام ہوچکا۔ مزید یہ کہ زور زبردستی کی یہاں گنجائش ہی نہیں۔ یہ سارے معاملات اور محرکات اس حدیث میں یکجا نظر آتے ہیں جس کو امام مسلم نے کتاب الاشربہ میں روایت کیا ہے۔ طویل حدیث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ولیمہ کے لئے کچھ مال حاصل کرنے کی غرض سے غزوۂ بدر کی غنیمت سے ملنے والی دو اونٹنیاں لے کر بنو قینقاع کی بستی میں جاتے ہیں تاکہ وہاں سے اذخر (ایک خوشبودار گھاس) لاکر کچھ کاروبار کریں۔ اتفاق سے جس گھر کے سامنے اپنی اونٹنیاں باندھ کر گئے تھے اس کے اندر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شراب نوشی میں مشغول تھے۔ ایک مغنیہ

انہیں گیت بھی سنا رہی تھی۔ اس نے کچھ ایسے اشعار پڑھے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جوش میں آ کر اٹھے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ان اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ واپس پر اس منظر کی تاب نہ لا سکے اور سیدھے بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شکایت کر دی۔ آپ ﷺ نے موقع پر پہنچ کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرنا چاہی مگر اس وقت ان پر اس قدر نشہ طاری تھا کہ بارگاہِ نبوی کے آداب کو ملحوظ نہ رکھ سکے اور ان کی زبان پر ایسے کلمات آ گئے جو کسی بھی طرح شانِ رسالت کے لائق نہ تھے۔ آپ ﷺ نے جب دیکھا کہ حضرت حمزہ اس وقت ہوش میں نہیں ہیں تو واپس تشریف لے آئے۔ (۱۹)

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ماہِ رمضان المبارک سن ۲ ہجری کو ہوا اور اسی سال ماہِ ذوالحجہ کو رخصتی عمل میں آئی۔ آپ رضی اللہ عنہ کو مزید سرمائے کے حصول کی کوشش میں بدر کے مالِ غنیمت سے ہاتھ آنے والی اونٹنیاں بھی کنوا بیٹھے تو یہ وقت آپ رضی اللہ عنہ پر کس قدر گراں اور معاملہ آپ رضی اللہ عنہ کی طبیعت پر کتنا شاق رہا ہوگا۔ نیز ان دنوں کے حالات کو نگاہ میں رکھ کر سوچا جائے تو یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ نزول کے اعتبار سے یہ آیات اسی ناخوشگوار واقعہ سے منسلک ہیں۔

تیسرا مرحلہ

اس مرحلے میں بھی پچھلے حکم پر کچھ مزید روشنی ڈالی گئی۔ اور چند اور اضافے کیے گئے ہیں۔ مثلاً نفع و نقصان کا تقابل کرتے ہوئے اس کے منافع کو اس کے نقصانات و مضرات کے مقابلے میں کمتر بتایا گیا ہے۔ اہلِ فہم و دانش کو قبل ازیں غور و فکر کی جو دعوت دی گئی تھی اس میں خطا کا بھی امکان تھا اور راہِ صواب کا ان کے سامنے رہنا اس لئے بھی ناگزیر تھا تاکہ اس کی روشنی میں وہ اپنی فکری جہتوں کا درست تعین کر سکیں۔ چنانچہ فزوں تر نقصانات کو دیکھتے ہوئے اس سے گریز و اجتناب کے جذبات کا ابھر آنا اور ان کا اس کی مخالفت و مذمت پر کمربستہ ہو جانا عین فطری امر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں سوالات پیدا ہو گئے تھے۔ اور یہ سوالات بارگاہِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تک آ پہنچے تھے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

یسئلونک عن الخمر والمیسر ط قل فیہما اثم کبیر و منافع للناس واثمہما اکبر من نفعہما ط (۲۰)

ترجمہ: شراب اور جوئے کے بارے میں آپ سے یہ لوگ سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے: ان دونوں میں ایک بڑا گناہ ہے اور لوگوں کی منفعتیں بھی اس سے وابستہ ہو گئی ہیں، اور ان کا گناہ ان سے حاصل ہونے والے نفع سے بڑا ہے۔

اس آیت مبارکہ میں شراب پینے اور جوا کھیلنے کے عمل کو ایک بڑے گناہ کا عمل بتایا گیا۔ اس گناہ کی سنگینی کے حوالے سے ایک واضح اشارہ بھی ملتا ہے۔ مگر دوسرے ہاتھ پر ''منافع للناس'' کے حکم نے اس کی شدت کو کافی کم کر دیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علمِ الٰہی میں شراب کا ام الخبائث ہونا تو ازل سے مقدر ہے۔ مگر ہنوز اس امر کے اظہار و انکشاف سے اجتناب پایا جاتا ہے۔ عرب شراب کے پرانے عادی تھے۔ اور انہوں نے نائونوش کی محفلیں سجانے کے لئے جابجا میکدے آباد کر رکھے تھے۔ عہدِ جاہلی کا ایک عرب شاعر ''عمرو بن قمیئہ'' کہتا ہے:

یا لہف نفسی علی الشباب ولم افقدبہ اذ فقدتہ امما

اذ اسحب الریط و المروط الی ادنیٰ تجاری و انفض اللمما (۲۱)

ترجمہ: جوانی پر ہائے مجھے دلی افسوس ہے۔ اور بات یہ ہے کہ جب میں نے اسے کھویا تو کوئی معمولی چیز نہیں کھوئی۔ یاد پڑتا ہے وہ وقت کہ جب میں قیمتی یمنی چادروں ریط اور مروط کا تہمد گھسیٹتا ہوا قریبی مے فروش کی طرف جایا کرتا تھا اور رو رو کر اپنی زلفوں کو چہرے سے پرے جھٹکتا تھا۔

یہ میکدے آباد رکھنے کے لئے نہایت عمدہ اور مہنگی قسم کی شرابیں انہوں نے ذخیرہ کر رکھی تھیں۔ شراب کا کاروبار زمانہ قبل از اسلام میں اور بعد ازیں قرآن مجید میں واردان تنبیہات کے نزول تک سرمایہ کاری کے تین اہم ترین اور بڑے میدانوں میں سے ایک تھا۔ دیگر دو میں سودی لین دین اور سب سے اہم اور بڑا میدان غلاموں اور باندیوں کا کاروبار تھا۔ یہ سرمایہ کاری کے ان میدانوں کا ذکر ہے جن پر شریعت اسلامی نے قدغن لگانا ناگزیر جانی۔ جبکہ سب سے زیادہ سرمایہ متوخر الذکر کاروبار پر لگا ہوا تھا۔ تجارتی منڈی سے زیادہ غلاموں اور باندیوں کا عربوں کی معاشرت سے ربط تھا۔ عربوں کا کاروبارِ حیات انہی کے سر پر چلتا اور انہی کے آسرے پر ان کا چولہا جلتا تھا۔ لہٰذا ایک بیک ان میں سے کسی کے بارے میں بھی حرمت کے احکام نازل ہو جاتے تو یہ حکمت و مصلحت کے خلاف اقدام شمار ہوتا۔ بڑے پیمانے پر سرمایہ کے اچانک ڈوب جانے سے عربوں کی معیشت و معاشرت اور اقتصادی حالت تباہ ہو جاتی اور یہ امر خدائے علیم و حکیم اور اس کے فرستادہ نبی رحمت کو گوارا نہ تھا۔ البتہ قرآن مجید نے جس انداز سے شراب کا ذکر چھیڑا تھا اس نے سرمایہ کاروں کو چونکا ضرور دیا تھا۔

Department of Islamic History
University of Karachi
LIBRARY